عالمی تنظیم تقریب مذاہب اسلامی

کے جنرل سکریٹری

پروفیسر واعظ زادہ خراسانی

سے ملاقات و گفتگو

مختلف اسلامی جماعتوں کے درمیان وحدت اسلامی کی تشکیل ہمیشہ سے ایک اہم ضرورت رہی ہے اور مسلم مفکرین ودانشوروں کی ایک بڑی جماعت کی یہ کوشش رہی ہے کہ اسلامی مذاہب کے درمیان وحدت واتحاد اور قربت وہم آہنگی پیدا کی جائے۔ گذشتہ صدی کے دوران شیخ محمود شلتوت، شیخ محمد عبدہ، سید قطب، علامہ بروجردی، آیت اللہ مرعشی نجفی، سید جمال الدین اسد آبادی اور شیخ حسن البنا جیسے نامور علماء ودانشوروں نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد کی بھرپور کوشش کی۔ ان بزرگوں کی کوششوں کو آگے بڑھاتے ہوئے گذشتہ چند دہائیوں کے دوران علامہ اقبال اور امام خمینی نے اس سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ یقیناً موثر اور سود مند ثابت ہوئی ہیں۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کے درمیان قربت پیدا کرنے کے لئے متعدد سرکاری اور غیر سرکاری تنظیمیں پوری طرح سرگرم عمل ہیں۔ تنظیم تقریب مذاہب اسلامی انہیں اداروں میں سے ایک ہے جو ہر سال عالمی سطح پر ایک عظیم اسلامی اجتماع کا اہتمام کرتا ہے جس میں شرکت کرنے والے دانشور حضرات اپنے مقالات کے ذریعہ لوگوں کو باہمی اتحاد کی دعوت دیتے ہیں۔

ذیل میں اس تنظیم کے جنرل سکریٹری واعظ زادہ خراسانی سے کی جانے والی گفتگو کا خلاصہ حاضر خدمت ہے۔

سوال: اسلامی مذاہب میں حکومت کا تصور دسویں وحدت اسلامی عالمی کانفرنس کا خصوصی

موضوع رہا ہے۔اس موضوع کے انتخاب کی وجہ کیا تھی؟

جواب: حضرت امام خمینی رضوان اللہ علیہ کی قیادت کے سایہ میں ایران میں عظیم الشان اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد اسلامی دنیا کے ہر گوشے میں سیاسی اور علمی ماہرین کے درمیان "اسلامی حکومت" کے موضوع پر بحث ومباحثہ کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس زمانے کا اہم ترین اسلامی موضوع بن گیا۔اس زمانہ میں پہلے ہی سے موجود اسلامی تحریکوں کی رفتار بڑھ گئی اور اسلامی اداروں نیز تنظیموں کی تعداد بھی روز بروز بڑھتی چلی گئی اور آج یہ تمام اسلامی ادارے اور تنظیمیں اپنے مشن میں ہمہ تن سرگرم ہیں بس فرق یہ ہے کہ ان میں سے بعض اداروں کا گرما گرم سیاسی یا فوجی جدوجہد سے کوئی سروکار نہیں ہے اور بعض تنظیموں میں یہ دونوں عنصر بھی موجود ہیں۔

آج بھی عالمی سیاسی فرہنگ وثقافت میں ان اسلامی وسیاسی تحریکوں کی مختلف تعبیرات پیش کی جاتی ہیں۔ عربی زبان میں ان تحریکوں کو "الصحوہ اسلامیہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور مغربی واسلام دشمن جماعت سے وابستہ افراد اور ادارے اس کو "اسلامی بنیاد پرستی" کے نام سے خطاب کرتے ہیں البتہ اس حقیقت کو نگاہ میں رکھنا لازمی ہے کہ اہل مغرب کی منطق کے بموجب بنیاد پرستی کو تشدد اور دہشت گردی کی فہرست میں رکھا گیا ہے۔ دنیائے اسلام کے کسی ایک علاقہ میں رونما ہونے والی سیاسی تحریکیں کبھی کبھی تشدد آمیز اور قتل وغارتگری کی حامل رہی ہیں لیکن اسلام دشمن جماعتوں، سامراجی محاذوں اور عالمی صہیونیت کے ٹھیکیداروں نے ہر اسلامی تحریک کو قتل وغارتگری اور دہشت گردی سے جوڑ دیا۔

اس مختصر سی تمہید کے ساتھ مختلف مذاہب ومکاتب فکر کے مطابق "اسلامی حکومت" کے بارے میں بحث ومباحثہ کی ضرورت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کیونکہ ہر اسلامی ملک میں ایک اسلامی مذہب رائج ہے اور یہ ایک فطری امر ہے کہ اگر اس اسلامی ملک یا علاقے میں اسلامی تحریک کامیاب ہو جائے تو اسی مذہب کے سیاسی قوانین کی بنیاد پر ہی حکومت کی تشکیل کی جانی چاہئے۔ دوسری طرف ان میں سے اکثر تحریکوں میں لازمی علم اور اس علاقے میں رائج مذہب کے لئے قابل قبول قانون اور

مرتب پروگرام کا فقدان ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی علاقوں میں رونما ہونے والی اکثر سیاسی تحریکوں میں فقہ یعنی مذہبی اصول و قوانین کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے چنانچہ تحریکوں سے وابستہ لوگ کسی فقیہ کو اپنے درمیان نہیں آنے دیتے یا حکومت کے لئے فقہ اور فقہا کی موجودگی کی اہمیت سے قطعی ناواقف ہوتے ہیں اور دنیائے اسلام کے لئے یہ بذات خود ایک بہت بڑا سانحہ اور حادثہ ہے کہ دنیا کے کسی اسلامی علاقے میں اسلامی حکومت کی تشکیل عمل میں آئے اور اس میں فقہ یا فقہا کے لئے کوئی جگہ نہ ہو۔ ایسی صورت میں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ اسلامی قوانین اور مغربی نظام حکومت کی مخلوط اور کھچڑی حکومت کی تشکیل عمل میں آجائے یا پھر ان کی سرگرمیوں کا دائرہ بعض محرمات کی روک تھام مثلاً مراکز فساد اور قمار خانوں پر کڑی پابندی کی حد تک ہی محدود رہ جائے۔ (جیسا کہ رفاہ پارٹی نے ترکی میں کر رکھا ہے) اور مالی، اقتصادی قانونی اور عدالتی شعبوں میں مفصل اسلامی احکام کو صرف یہ کہہ کر چھوڑ دیا جائے کہ یہ اسلامی قوانین موجودہ دنیا میں رائج قوانین سے میل نہیں کھاتے ہیں اور ان کی جگہ پر ایسے احکام و قوانین کو گلے لگایا جائے جو اسلام کی روح سے مطابقت نہیں رکھتے ہیں۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو قوانین اسلام کی روح سے میل نہ کھاتے ہوں انہیں اسلام کے نام سے اسلامی حکومت کی چھتری کے سایہ میں مسلمانوں پر مسلط کر دیا جائے۔

ان اسلامی تحریکوں کے لئے دوسرا بڑا اور مہلک خطرہ یہ ہے کہ عالمی سامراج، بین الاقوامی صہیونیت اور ثقافتی حملات کے سلسلے میں ان اسلامی تحریکوں کے درمیان غیر معمولی اختلافات موجود ہیں اور مذکورہ مسائل کے سلسلے میں اسلامی ممالک میں مختلف رجحانات پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان اسلامی تحریکوں نے اسلامی جمہوریہ ایران کی حکومت کے سلسلے میں الگ الگ موقف اختیار کر رکھا ہے مثلاً ایک مقالہ میں یہ کہا گیا ہے کہ مصر میں سر دست دس اسلامی تحریکیں سرگرم عمل ہیں لیکن ان میں سے صرف ایک تحریک انقلاب اسلامی ایران کی حمایت کرتی ہے بقیہ تحریکیں یا ایران کی مخالف ہیں یا اس سے بالکل بیگانہ ہیں۔

اب اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ تحریکیں کامیابی کی منزلیں طے کرتے ہوئے مسند اقتدار تک پہونچ جاتی ہیں تو ان کے درمیان اس قسم کے اختلافات اور بڑھ جائیں گے اور ان اختلافات کا

آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلامی تحریکوں نے اس ملک میں کامیابی تو حاصل کرلی ہے لیکن ان کی راہ وروش میں موجود بنیادی اختلافات کی وجہ سے اب تک اس ملک میں استحکام نہیں پیدا ہوسکا جبکہ تمام افغانی تحریکیں اسلامی اور جہادی ہونے کی دعویدار ہیں۔

ہم اسلامی مذاہب کے نقطہ نظر سے حکومت کے فلسفے کو پوری طرح واضح کرتے ہوئے اس بات کی کوشش کریں گے کہ لوگوں کے افکار وعقائد کے درمیان قربت ونزدیکی پیدا ہو اور جہاں تک ممکن ہو اسلامی تحریکیں واحد لائحہ عمل کو بروئے کار لاتے ہوئے آگے قدم بڑھائیں یا پھر ان کی راہ وروش میں قربت ونزدیکی پیدا ہو جائے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی وہ اسباب وعوامل ہیں جن کے ذریعہ انقلاب اسلامی ایران نے عظیم الشان کامیابی حاصل کی ہے یعنی دوسرے لفظوں میں اگر مختلف جماعتوں کے درمیان فکری قربت ونزدیکی کو انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی کا راز کہا جائے تو قطعی مبالغہ نہ ہوگا۔

سوال: اسلامی مذاہب اور فرقوں میں موجود فقہی میراث میں اسلامی حکومت کے موضوع پر کس حد تک گفتگو کی گئی ہے اور سنی وشیعہ جماعتوں میں سے کس فرقہ کے علماء نے اس سلسلے میں زیادہ علمی کام انجام دیئے ہیں۔

جواب: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب تک "اسلامی حکومت" کے سلسلے میں دو طرح کی بحث وعلمی کاوش عمل میں آئی ہے۔ ان میں سے ایک خلافت وامامت کا موضوع ہے اور یہ کہ کیا حکومت کی بنیاد نص ہے یا شوریٰ؟ یہ سنی اور شیعہ مذاہب کے درمیان ہونیوالی وہی طولانی بحث ہے جس کا شمار گرم ترین کلامی بحث میں ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس سے زیادہ بے فائدہ کوئی دوسری بحث نہیں ہوسکتی۔ اس طولانی بحث کی تکرار کی بنیادی وجہ دونوں مذاہب کی پیروری کرنیوالوں کے درمیان موجود حساسیت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور معاشرہ میں رائج نظام اور حکومتوں نے بھی اس بحث سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اور اس اختلاف کو فروغ دینے میں نمایاں کردار بھی ادا کیا ہے اور ان مذاہب کے علماء نے اپنے طرفداروں کے درمیان اپنی حیثیت کو اور زیادہ مستحکم اور موثر بنائے رکھنے کے لئے ان اختلافات کو قائم رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور دونوں حق کا دفاع کرتے رہے ہیں۔

لیکن ہم نے اس بحث کو بے قابو اور بے فائدہ ترین بحث اس وجہ سے کہا ہے کہ اس بحث کا تعلق ماضی سے ہے اور مسلمانوں کی موجود حالت کو سنوارنے میں اس کا کوئی کردار نہیں ہے بلکہ اس سے نقصان زیادہ ہوتا ہے اور اس سے مسلمانوں کے درمیان عداوت و دشمنی میں اضافہ ہوتا ہے۔

جی ہاں! حکومت کی بنیاد کے سلسلے میں سنی اور شیعہ جماعتوں کے درمیان موجود یہ اختلاف مسلمانوں کے موجودہ سیاسی لائحہ عمل میں مدد و معاون ثابت ہو سکتا ہے لیکن اس قسم کی عداوت اور محاذ آرائی نہ ہونی چاہئے کہ ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگیں یا ایک جماعت دوسری جماعت کے مسلمانوں کو اسلام سے منحرف، بدعتی اور مشرک کہنے لگے۔ جی نہیں امت مسلمہ کے درمیان اختلاف کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کیونکہ اس قسم کی بحث سے کبھی کوئی نتیجہ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔

بحث کی دوسری نوعیت اسلام کی موجودہ فقہی میراث میں اسلامی حکومت کے سلسلے میں ہے اور یہ وہی تعمیری بحث ہے جو "احکام السلطانیہ" جیسی کتابوں اور مذہب اہلسنت کی فقہی کتابوں میں موجود سیاسی مباحث سے تعلق رکھتی ہے۔

لیکن مذہب شیعہ کے اعتبار سے یہ بحث متاخرین کی کتابوں میں بدرجہ اتم موجود ہیں یعنی صفوی دور حکومت اور اس کے بعد کے عہد میں، جب سیاسی اقتدار کی باگ ڈور شیعوں کے ہاتھ میں تھی، ان مباحث پر سیر حاصل بحث دکھائی دیتی ہے جیسے "راضی خراجیہ"، "احکام اھل کتاب" یا "اھل ذمہ"، "جہاد با کفار"، "سلطنت کی مشروعیت کی کسوٹی" یا "حکومت مشروطہ" اور فقہا و سلاطین کے درمیان سیاسی مسائل کے سلسلے میں انجام پانے والی بحث وغیرہ لیکن ان میں سے سب سے زیادہ مفصل اور بنیادی اہمیت والی بحث "فقیہ کا دائرہ اختیارات اور "فقیہ کی ولایت مطلقہ کا نظریہ ہے جو بظاہر صفوی دور حکومت کے اواخر اور قاجاری حکومت کے ابتدائی دور میں بالکل واضح انداز میں شیعی فقہ کا اہم حصہ بن گیا۔ اس سے قبل اس سلسلے میں جو بھی بحث عمل میں آئی وہ نہایت مختصر اور معنی و مفہوم سے عاری نظر آتی ہے اور وہ بھی فقہی کتابوں میں مختلف ابواب کے ذیل میں اس موضوع کی طرف اجمالی انداز میں اشارہ دکھائی دیتا ہے جیسے باب قضا، حدود، زکوۃ اور نماز جمعہ وغیرہ میں اس موضوع کی ہلکی سی جھلک محسوس کی جا سکتی ہے۔ البتہ اس سلسلے میں قدماء کی کتابوں کے مطالعے کے ذریعہ اس بات کی

تحقیق ضروری ہے کہ شیعہ علماء میں سے کس عالم دین نے اس موضوع پر پہلی بار بحث کی ہے اور موضوع امامت سے متعلق کلامی بحث سے الگ ہٹ کر ولایت فقیہ کی بات کہی ہے۔

لیکن اس حقیقت کا اعتراف لازمی معلوم ہوتا ہے کہ حکومتی امور و معاملات اور اسلامی حکومت کا تصور صدر اسلام ہی سے اہل سنت کی فقہی اور کلامی کتابوں میں موجود رہا ہے اور اس کے مختلف حصوں کو اجاگر کرنے کے لئے علماء نے نہایت مفید جواب فراہم کئے ہیں چنانچہ موجودہ دور میں اسلامی حکومت کے موضوع پر ایران میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں ان کتابوں سے پوری طرح فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

انصاف سے دیکھا جائے تو اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد شیعہ مذہب کے علماء بالخصوص ایرانی علماء نے اس موضوع کے بارے میں بہت کام کیا ہے اور یہ ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ اگر دوسرے مسلمان حضرات اسلامی حکومت کی بحث کو آگے بڑھانا چاہیں تو انہیں بہر حال عصر حاضر کے شیعہ علما کے علمی آثار کا سہارا لینا پڑے گا۔

سوال: اسلامی جمہوریہ ایران کے سیاسی ڈھانچے میں فقیہ کی ولایت مطلقہ کو بنیادی محور و مرکز قرار دیا گیا ہے۔ کیا علمائے اہلسنت بھی اس نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں؟

جواب: اصولی اعتبار سے دیکھا جائے تو ولایت فقیہ ایک شیعی اصطلاح ہے جو گذشتہ دو تین صدیوں کے دوران منظر عام پر آئی ہے۔ ماضی میں اہلسنت بھی اسلامی حاکم یا خلیفہ کا عالم ہونا اور فقیہ ہونا لازمی سمجھتے تھے جو کتاب و سنت نبوی کی حد تک "ولایت مطلقہ فقیہ" کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔

مثلاً زکوٰۃ لینا، یتیموں کی سرپرستی کرنا، قاضی اور ائمہ جمعہ و جماعت کی تقرری کرنا، جنگ و صلح کا فرمان جاری کرنا اور حکومت سے متعلق دیگر تمام امور کے بارے میں، جن کا ذکر "احکام السلطانیہ" جیسی کتابوں میں موجود ہے، آخری فیصلہ اسلامی حاکم کیا کرتا تھا۔ لہٰذا اس سوال کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اہلسنت اسلامی حکمراں کے لئے زیادہ اختیارات کے قائل ہیں جو کسی حد تک "ولایت مطلقہ فقیہ" سے مطابقت رکھتے ہیں لیکن اہلسنت اس کو ولایت فقیہ نہیں بلکہ "اختیارات حاکم" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

سوال: دینی افکار و عقائد کے احیاء میں امام خمینی نے کیا کردار ادا کیا ہے؟ مسلمان دانشوروں نے سیاسی مسائل کو کس حد تک دین مبین اسلام کی روشنی میں دیکھنا شروع کر دیا ہے؟

جواب: اس سلسلے میں "دینی افکار کا احیاء اور امام خمینی" کے عنوان سے میرا ایک مفصل مقالہ 'امام خمینیؒ اور اسلامی انقلاب' نامی کتاب میں شائع ہو چکا ہے اور یہ کتاب آستان قدس رضوی نامی تنظیم کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ اس مقالے میں میں نے بڑی تفصیل سے حقیقی اسلامی افکار و عقائد کی تجدید میں امام خمینی کی ہمہ جہتی خدمات کا جائزہ پیش کر دیا ہے۔ سب سے پہلے میں اسلام کی حقیقی تعریف اور اس کی گوناگوں صفات کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں میں نے اسلام کی آٹھ ایسی صفات کا ذکر کیا ہے جس کو لوگ بھلائے بیٹھے تھے اور اسلامی احکام کی بنیاد پر اسلامی حکومت کی تشکیل ان آٹھ صفات میں سے ایک اہم صفت ہے۔ اس کے بعد میں نے ان فراموش شدہ صفات میں سے ہر ایک صفت کو اجاگر کرنے میں امام خمینی کی خدمت کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے اس مقالہ کا خلاصہ کچھ اس طرح سے ہے۔

ماضی میں گھر، مدرسہ اور اسلامی معاشرہ میں اصول و فروع دین کو اس انداز سے پیش کیا جاتا تھا کہ مذکورہ تمام باتیں تو درست ہوا کرتی تھیں لیکن ان باتوں سے اسلام کا حقیقی چہرہ سامنے نہیں آتا تھا لیکن امام خمینی نے اسلام کے چہرے کی مکمل شناخت پیش کر دی اور اس کی مندرجہ ذیل صفات کو پوری طرح نمایاں بنا دیا۔

۱۔ وحدت ۲۔ اعدا کے خلاف جہاد۔ ۳۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ۴۔ امت خیر ۵۔ باہمی ذمہ داری ۶۔ اصلاح کی فکر ۷۔ اسلامی غیرت ۸۔ دین کی بنیاد پر حکومت

امام خمینی نے ایران کی دینی درسگاہوں میں نیز جلاوطنی کے دوران نجف اشرف میں تقریباً ۳۰ سال بلکہ اس سے پہلے سے درس خارج دینا شروع کر دیا تھا اور وہ علماء و فضلاء نیز مجتہدین اور مدرسین کی ایک ایسی نسل کی تربیت میں پوری طرح کامیاب رہے جو امت واحدہ کے حقیقی معنی و مفہوم سے بخوبی واقف اور اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو، اسلام کو ایک مکمل مکتب فکر کا درجہ عطا کرتی ہو، دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کے سلسلے میں ایک مسلمان کی کیا ذمہ داری ہے اس سے بخوبی آشنا ہو۔ اسلامی

حکومت کی تشکیل کے فریضہ سے آگاہ ہو۔امام خمینی کی تربیت کے سایہ میں پروان چڑھنے والے ان علماء کواس بات کا بخوبی علم واحساس تھا کہ مسلمانوں کے جملہ امور کے سلسلے میں ان کا فریضہ کیا ہے،ان کی ذمہ داری کیا ہے اور غیر اسلامی افراد کی حفاظت کا کام کس طرح انجام دینا ہے۔ یہ لوگ اس قسم کے مسائل و معاملات سے بخوبی آگاہ اور اہم فرائض کی انجام دہی کے لئے ہمہ وقت اور ہمہ تن آمادہ رہا کرتے ہیں۔

اگرانہیں یہ توفیق حاصل نہ ہوتی اور انہوں نے علماء ودانشوروں کی اتنی بڑی تعداد کی تربیت کا کارنامہ انجام نہ دیا ہوتا تو دور دور تک ایسا کوئی نہ تھا جو حقیقی اسلام محمدی کی طرف لوگوں کو مدعو کرتا۔ لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کرتا اور حقیقی اسلام کو جو امتیازات حاصل تھے وہ لوگوں تک پہونچانے کا کام انجام دیتا۔امام خمینی کو مزید یہ توفیق بھی حاصل ہوئی کہ وہ اپنے انہیں شاگردوں کی حمایت کے ذریعہ اسلامی حکومت قائم کریں اور اس حکومت کی بقاء وسلامتی کے لئے انہوں نے بعض دوسرے اہم عبادتی اور سیاسی فریضہ کا احیاء کیا جس کو ایرانی معاشرہ نے بالکل فراموش کردیا تھا۔دوسرے مرحلے میں انہوں نے ایرانی معاشرہ کے درمیان فریضہ حج کی ترویج و مقبولیت کا کام انجام دیا، تیسرے مرحلے میں انہیں امت اسلامیہ کو سیاسی اقتصادی اور ثقافتی اعتبار سے پوری طرح آزاد رکھنے کی فکر دامنگیر ہوئی اور چوتھے مرحلے میں انہوں نے مسئلہ فلسطین کو اس انداز میں پیش کیا کہ پوری اسلامی دنیا اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ میں نے ان کے علاوہ کسی دوسرے آدمی کو نہیں دیکھا جس کو اسرائیل کے خطرے کا اتنا گہرا احساس رہا ہو۔اس میں کوئی دورائے نہیں کہ امام خمینی مسئلہ فلسطین کی طرف پوری سنجیدگی کے ساتھ متوجہ تھے اور فلسطینی مظلوموں کے درد کا انہیں مکمل اور غیر معمولی احساس تھا۔

امام خمینی نے اسلامی دنیا میں ان مباحث کو پیش کرتے ہوئے عملی سیاست وجدوجہد کے میدان میں قدم رکھا۔انہوں نے ان تمام پہلوؤں کے ساتھ دنیا میں اسلام کو ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے پیش کیا اور مسلمانوں کے خوابیدہ ضمیر کو پوری طرح بیدار کردیا۔انہوں نے امت اسلامیہ کو مخاطب کرتے ہوئے "جاگتے رہو" کی ایسی موثر آواز لگائی کہ ساری دنیا کے لوگ بالخصوص مسلمان اپنی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ ہوگئے اور دنیائے اسلام کے دانشوروں کی جماعت بھی امام خمینی کی

آواز سے ہمہ تن بیدا ہو گئی اور سبھی لوگ اسلام کے تعمیری پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں سرگرم ہو گئے۔

سوال: آج علمی اور ثقافتی معاشروں میں ولایت فقیہ اور حق حاکمیت کے درمیان رابطہ کے سلسلے میں گفتگو جاری ہے۔ کیا آپ کے خیال میں ولایت فقیہ کو لوگوں کے ووٹ یا ان کی بیعت سے مشروعیت حاصل ہوتی ہے یا لوگوں کی بیعت فقط مصداق کا تعین کرتی ہے۔

جواب: ولایت فقیہ کی مشروعیت امام کے حکم واذن سے اور امام وپیغمبرں کی ولایت کی مشروعیت خداوند کے حکم وفرمان سے وابستہ ہے۔ اصولاً اسلامی نقطہ نظر سے سیوائے خداوند عالم کے کسی انسان کو دوسرے انسان پر ولایت کا حق حاصل نہیں ہے۔ تمام بنی نوع انسان خداوند عالم کی ولایت وحاکمیت کے سایہ میں زندگی بسر کرتے ہیں اور حق حاکمیت فقط قادر مطلق کو حاصل ہے۔ یہ خداوند عالم کی ذات مقدس ہے جو انبیاء، ائمہ، فقہااور ان کے مقرر کردہ حکام کو صاحب ولایت قرار دیتا ہے۔ ولایت کا عام مفہوم ومطلب امر ونہی کا حق ہے جو اختیارات کے دائرہ میں پیش کیا گیا ہے اور تمام امور ومراتب میں جاری وساری ہے اور اس کے تمام مراتب ولایت خداوندی سے وابستہ ہیں۔ لہ الخلق والامر" پس ولایت کا جو مرتبہ سلسلۂ مراتب کے ساتھ خداوند عالم کی ذات پر ختم ہوتا ہے وہ ہر اعتبار سے مشروع اور جائز ہے اور مجموعی اعتبار سے تمام اسلامی فقہا یعنی سنی وشیعہ ماہرین علم فقہ اس کی حمایت وتائید کرتے ہیں اور ہر شخص پیغمبر کی نیابت میں اسلامی حکومت کا قائل ہے اور قاعدے سے ہونا بھی یہی چاہئے۔ یہاں تک کہ جو لوگ حکومت کو مذہبی کام نہیں تسلیم کرتے ہیں بلکہ ایک سماجی اور عوامی کام مانتے ہیں انہیں بھی تشکیل حکومت کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھانے کے لئے خداوند عالم سے اجازت لینی چاہئے لیکن پیغمبر اسلام کی نیابت وخلافت میں نہیں بلکہ ایک مباح اور مشروع کام کی حیثیت سے جس کی شرع اجازت دیتی ہو۔

اس بنیادی بات کی مکمل وضاحت کے بعد اب اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہوگا کہ ولایت فقیہ شرع سے وابستہ ہے یا عوام کی بیعت اور پیروی سے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مختلف اقوال وعقائد کے بموجب اسلامی حاکم کی مشروعیت کا تعلق خدا سے ہے یہاں تک کہ عوامی اور شرعی احکام سے کوئی رابطہ نہ رکھنے والی حکومتوں کے بارے میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ یہ بھی خداوند عالم پر متکی ومنحصر ہیں۔

لیکن اسلامی حکومت کی مشروعیت، جو سلسلہ مراتب کے ساتھ خداوند عالم تک پہونچتی ہے، خداوند عالم کی نیابت کی حیثیت سے پوری طرح شرع سے وابستہ ہے کیونکہ کوئی شخص خداوند عالم کی اجازت کے بغیر اپنے آپ کو خدا کا ولی نہیں سمجھ سکتا ہے۔ یہاں تک کہ برادران اہلسنت، جو خلیفہ کی تقرری کے سلسلے میں ووٹ اور شورا پر انحصار کرتے ہیں اور نص پر تکیہ نہیں کرتے، خلیفہ کو پیغمبر کا جانشین اور خدا کا ولی مانتے ہیں کیونکہ لوگوں نے اس شخص کو نمایاں کردیا ہے جبکہ جو لوگ نص کے قائل ہیں وہ لوگ نہ صرف امام کی حکومت کی مشروعیت کو بنیادی طور پر منجانب خدا تسلیم کرتے ہیں بلکہ امام کے تقرر کو بھی حکم خداوندی کے مطابق مانتے ہیں اور لوگوں کے ووٹ کے ذریعہ کسی شخص کو امام اور ولی نہیں تسلیم کرتے اور غیبت کے زمانہ میں نص کے قائل افراد مرد فقیہ کی حکومت کی مشروعیت کو امام زمانہ کی اجازت کی وجہ سے مستند مانتے ہیں کیونکہ انہوں نے فقط ان صاحبان ولایت کو ہی اس کام کے لئے مقرر کیا ہے جو ان کے بیان کردہ اوصاف کے حامل ہوں۔ امام زمانہ کا ارشاد گرامی ہے۔" وامامن كان من الفقهاء صائنا انفسه ، حافظا لدينه ، مخالفا لهواه ومطيعا لامره "پس انہوں نے کسی شخص خاص کا تقرر نہیں کیا ہے بلکہ مذکورہ صفات کے حامل فقیہ کو" خصوصی نیابت" کا نہیں بلکہ "نیابت عامہ" کا حق حاصل ہے۔

"مخصوص نیابت" ان کی موجودگی کے ایام میں غیبت صغریٰ کے دوران کچھ مخصوص افراد کو ہی حاصل تھی جو محدود اختیارات کے حامل تھے اور انہیں تشکیل حکومت وغیرہ کا حق حاصل نہیں تھا جیسے "نواب اربعہ" یا ان سے قبل وہ تمام افراد جو دیگر ائمہ کے نائب کی حیثیت سے دور ونزدیک کے علاقے میں تعینات تھے۔ زیدیہ جماعت والے بھی اپنے ائمہ کی مشروعیت کو "جو حسن وحسین اور فاطمہ علیہم السلام کی نسل سے ہیں، شرع کی جانب سے مقرر کی گئی صفات کے مطابق جانتے ہیں۔" كل فاطمی فقيه عادل قائم بالسيف " جی ہاں! چونکہ فقیہ کو عام نیابت حاصل ہوتی ہے لہذا مشروعیت کی بنیاد امام کی طرف سے بیان کی گئی صفات کے ساتھ وابستہ ہے لیکن اشخاص کا تقرر قہراً عوام کی تشخیص سے وابستہ ہے لیکن یہ تشخیص بھی مخصوص شرعی اصول وضوابط کے مطابق ہوگی۔ اب اگر عوام نے کسی شخص کو ان صفات کا حامل قرار دیدیا اور اس شخص کے سلسلے میں عمومی اتفاق حاصل

ہو گیا تو اس شخص کا فریضہ ہے کہ وہ تشکیل حکومت کا حکم جاری کرے لیکن عوام کے نمائندہ کے حیثیت سے نہیں کیونکہ اس کی حکومت کی مشروعیت کی کسوٹی عوام نہیں ہیں بلکہ ایک نائب امام کی حیثیت سے ہے کیونکہ عوام نے بھی امام کے حکم اور اصول قوانین کی پیروی کرتے ہوئے انہیں ان صفات کا مصداق تشخیص کیا ہے۔

جی ہاں! جواب یہ ہے کہ فقیہ کی حکومت کی مشروعیت کا تعلق شرع سے ہے اور عوام فقط مصداق کا تعین کرنے والے ہیں بالکل اسی طرح جیسے لازمی صفات و استعداد رکھنے والے افراد کو قاضی، امام جمعہ اور دیگر عہدوں پر مقرر کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں میرا ذاتی خیال اس نظریہ سے قدرے مختلف ہے لیکن اس کو سمجھانے کے لئے تفصیلی بحث و تجزیہ لازمی ہے لہٰذا سر دست اس کا ذکر نہیں کیا جارہا ہے۔

سوال: اسلامی نقطہ نظر سے حکومت کا ایک منظم و مفصل منصوبہ پیش کرنے میں اسلامی جموریہ ایران کے آئین کی برکتوں کا تذکرہ کیجئے۔

جواب: میرا خیال ہے کہ اسلامی جمہوریہ ایران کا آئین ایک کامل ترین منصوبہ ہے جس کو شیعی عقائد کے مطابق اور مختصر فرق کے ساتھ دیگر اسلامی مذاہب کے عقائد کے مطابق اسلامی حکومت کی تشکیل کے سلسلے میں پیش کیا جاسکتا ہے اور جس کے نمایاں حصوں کو ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

۱۔ حکومت الٰہی اور رائے عامہ کے درمیان قربت و تال میل جو آج بھی بظاہر مشکل نظر آتی ہے۔

۲۔ مسئول افراد اور حکمراں طبقے کی آزادی و خود انحصاری کی حفاظت کرتے ہوئے جملہ اہم امور و معاملات میں ولی فقیہ کی حکومت قائم کرنا

۳۔ ایرانی پارلیامنٹ یا دیگر قانون ساز اداروں میں بنائے گئے قوانین کو شواری نگہبان کے ذریعہ اس انداز میں کنٹرول کروانا کہ شرعی قوانین اور اسلامی جمہوریہ ایران کے آئین کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی نہ ہو۔

۴۔ تشخیص مصلحت اجلاس کی تشکیل کے ذریعہ قوانین میں موجود رکاوٹوں کو دور کرنا۔
۵۔اس قرآنی نص کے بموجب کہ حضرت رسول اکرمؐ کے لئے بھی ایک فریضہ رہا ہے۔ مقام معظم رہبری کے ذریعہ قائد کے مشاہدین کے مسائل کا حل۔
۶۔ تین اہم حصوں یعنی حکومتی، تعاونی اور ذاتی نظام کے سایہ میں اقتصادی سرگرمیوں کو فروغ دینا۔
۷۔ فقہی بنیاد پر عمومی اور حکومتی اموال پر اسلامی حکومت کے اختیارات کی حدود کی تعین
۸۔اسلامی مذاہب کو سرکاری حیثیت عطا کرنا اور آئین کے متن میں ان مذاہب کا ذکر نیز اسلامی جمہوری آئین میں مذہب جعفری کی حقیقت و بنیادی حیثیت کی حفاظت کرتے ہوئے ان مذاہب کی آزادی کی حدود کا تعین کرنا۔
۹۔ حقیقی ارکان حکومت کے درمیان طاقت کی صحیح تقسیم اور ان کے درمیان توازن پر نگاہ رکھنا۔
۱۰۔ اسلامی ممالک اور مذہبی اقلیتوں کے ساتھ حسن روابط، خوش اخلاقی اور عمومی فرھنگ کی تبلیغ واشاعت پر زور دیتے ہوئے ملک کی خارجہ سیاست میں حکیمانہ موقف اختیار کرنا۔

سوال: بعض ملکوں میں متعدد مذاہب کا مسئلہ ایک ایسا موضوع ہے جو اسلامی فقہ کی بنیاد پر معاشرہ کی مدیریت کو مختلف النوع مشکلات سے دوچار کر دیتا ہے۔ تقریب مذاہب کے اعتبار سے اس مسئلہ کا حل کیا ہے اور اس سلسلے میں اسلامی جمہوریہ ایران کا تجربہ کیسا ہے؟

جواب: شیعہ مذہب نے، جو ایرانی عوام کی اکثریت کا مذہب ہے، ملک کے آئین کو جملہ قوانین کی کسوٹی قرار دیا ہے اور آئین میں تمام دوسرے مذاہب کا احترام کرتے ہوئے ان معروف اسلامی مذاہب کی پیروی کرنے والوں کو عبادات واحکام، قانونی املاک، تعلیم و تربیت، عدالت، پارلمانی انتخابات اور چھوٹے بڑے عہدوں کے لئے جدوجہد کی مکمل آزادی فراہم کی گئی ہے۔

سوال: اسلامی سیاسی مکتب فکر کے بموجب ایک اہم اور قابل تجزیہ موضوع خود حکومت کا ڈھانچہ ہے جس نے ایران میں اسلامی جمہوریت کے قالب میں عملی رنگ وروپ اختیار کیا ہے اور قانون کی حقیقی ماہیت کو مقام معظم رہبری کی حمایت وسرپرستی کے سایہ میں ہی تسلیم کیا گیا ہے۔ کیا جناب عالی کی نظر میں اسلامی نظام کے لئے یہی ڈھانچہ قابل قبول ہے؟ یا اسلام کے سیاسی اصول اور

معیاری اسلامی قدروں کو دوسرے اسلامی قالب میں بھی پیش کیا جاسکتا ہے؟

جواب: نہیں۔ اسلامی حکومت کو فقط "اسلامی جمہوریت" کے موجودہ ڈھانچے کی حد تک ہی محدود نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آئین میں ولایت فقیہ کی حاکمیت کی بنیاد پر ہمارے حکومتی نظام کو، خواہ کسی بھی نام سے پکارا جائے، وہ درحقیقت اسلامی نظام ہے جس کو نظام ولایت فقیہ کے نام سے یاد کیا جانا زیادہ بہتر ہے۔

ایران کے آئین میں مثال کے طور پر رہبر کی بیعت اور مشاورین کے ساتھ قائد کے صلاح ومشورہ کی بات نہیں کہی گئی ہے اور یہ بات ممکن تھی کہ قائد کے مشاورین کا خصوصی طور پر ذکر کردیا جاتا۔ بالکل اسی طرح جیسے حکومت کی صدارت کا کام رہبر کے ذریعہ سپرد کیا جاتا ہے آئین میں اس کا بھی ذکر آجاتا جبکہ نظام امامت ونظام خلافت میں یہ بھی بات موجود رہی ہے۔ آخرکار رہبر کو اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ وہ فرائض کی تعمیل کے لئے کسی کو بھی مقرر کرسکتا ہے بالکل اسی طرح فوجی طاقتوں کے درمیان علحدگی دوسری صورتوں میں بھی ممکن ہے لیکن حقیقی اور بنیادی اعتبار سے یہ تمام فرائض رہبر سے وابستہ ہیں جو پیغمبر اور ائمہ کا جانشین ہے جیسے خلیفۃ الرسول۔ ممکن ہے کہ مسلسل تجربات کے پیش نظر اس نظام کے رنگ وروپ میں دھیرے دھیرے کچھ تبدیلیاں لازمی ہوجائیں بالکل اسی طرح جیسے وزارت عظمیٰ اور عدالتی شعبے میں شورائی طرز اور خود شورای رہبری سے متعلق دفعات کو سابق آئین سے حذف کردیا گیا ہے اسی طرح مستقبل میں بھی تبدیلیوں کو کو بعید از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔

سوال: آج۔ "اسلامی بیداری" کی لہر مشرقی ایشیا سے لیکر جنوبی افریقہ اور یورپی ومغربی ممالک میں بھی دکھائی دیتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اسلامی بیداری پوری دنیا پر چھاگئی ہے۔ اس ترقی پذیر تحریک کے سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اسلامی بیداری کی اس عالمی لہر میں انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی کا نمایاں حصہ رہا ہے لیکن الحاد ومادیت پر مبنی ممالک کی پسماندگی اور اسلامی ممالک نیز مشرق ومغرب کے دیگر ممالک پر حاکم نظام حکومت کی شکست وناکامی کے بعد اس تحریک نے انقلابی

رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ دنیا "متمدن اور مہذب" معاشروں میں فاسد حرکتوں کی بھرمار، لامذہبیت اور بد نظمی ولاابالی پن سے پوری طرح تھک چکی ہے اور انسانی معاشرہ بلکہ عالمی انسانی برادری پہلے سے کہیں زیادہ ایک عادلانہ نظام حکومت کی محتاج ہے اور اسلامی بیداری ان کی اس ضرورت کو پورا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

یہ ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ ۲۱ویں صدی معنویات اور ادیان و مذاہب کی صدی تھی بالکل اسی طرح جیسے بیسیوں صدی الحادی اور مادی افکار و عقائد کی صدی ہے اور ۱۹ویں صدی علم وصنعت کی صدی کہلاتی ہے۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنی تشکیلات کو ۲۱ویں صدی کے سانچے میں ڈھال لیں اور ساری دنیا پر اس حقیقت کو بخوبی واضح کر دیں کہ موجودہ اسلامی نظام حکومت میں ۲۱ویں صدی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے

سوال: اسلامی تحریکوں میں عملی طور پر سرگرم افراد اور جماعتوں کے درمیان قربت و نزدیکی پیدا کرنے اور انہیں تفرقہ واختلاف سے دور رکھنے میں "تقریب مذاہب" نامی تنظیم نے کیا کردار ادا کیا ہے؟

جواب: جی ہاں! اسلامی بیداری اور عصر حاضر میں بڑی تیز رفتاری کے ساتھ رونما ہونے والی اسلامی تحریکوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ اسی بات کا ہے کہ کہیں ان کے درمیان تفرقہ واختلاف نہ پیدا ہو جائے اسی وجہ سے عالمی ادارہ تقریب مذاہب اسلامی ہر سال عالمی وحدت اسلامی کانفرنس کے دوران نیز دیگر اجتماعات کی مدد سے ان خطروں کو دور کرنے کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ اگر آج عالم اسلام کی اسلامی تحریکوں کو ہم آزاد چھوڑ دیں اور ان کے لئے لائحہ عمل تیار نہ کریں اور ان کے نظریات کو اسلامی حکومت کے سیاسی نظام میں جگہ نہ دیں اور ان افراد و جماعتوں کو سطحی اختلافات کے باوجود قریب لانے کی کوشش نہ کریں تو یہ اسلامی بیداری محض ایک حادثہ بن کر رہ جائے گی۔

سوال: جناب عالی! اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ مختلف اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں کا سفر کر چکے ہیں اور دوران سفر مسلمانوں کے بڑے بڑے سیاسی اور سماجی لیڈروں اور نامور شخصیتوں سے ملاقات و گفتگو بھی کر چکے ہیں۔ دنیا کے سیاسی لیڈران امام خمینی کے سیاسی نظام سے کس حد تک موافق ہیں؟ ان معاشروں کے درمیان اسلامی انقلاب کا مقام کیا ہے؟ اور یہ لوگ مقدس اسلامی جمہوری نظام

سے کیا امید رکھتے ہیں؟

جواب: پہلے مرحلہ میں یہ سمجھ لیجئے کہ ان لوگوں کا نظریہ مثبت ہے۔ یہ لوگ انقلاب اسلامی ایران اور امام خمینی کا غیر معمولی احترام کرتے ہیں اور ان لوگوں کو یہ قوی امید ہے کہ اسلامی انقلاب دنیائے اسلام کی پریشانیوں کو دور کرنے میں یقیناً کامیاب ہوگا۔ لیکن یہ ابتدائی مرحلہ کا نظریہ ہے اور اسلامی انقلاب کے ابتدائی دنوں میں تقریباً عمومیت کا حامل تھا لیکن دھیرے دھیرے حکمراں طبقے کے علاوہ مسلمان علماء کی زہرافشانیوں نیز مغربی سامراج کے بے بنیاد پروپگنڈوں اور مذہب تشیع پر لگائے گئے جھوٹے الزامات کی وجہ سے بعد کی منزل میں انقلاب اسلامی ایران اور امام خمینی کے سلسلے میں اسلامی افراد اور جماعتوں کے نظریہ میں مکمل تبدیلی پیدا ہوگئی۔ لیکن دنیا کے جن علاقوں میں اسلام دشمن پروپگنڈوں کی رسائی نہیں ہو سکی ہے وہ لوگ آج بھی اپنے نظریہ پر قائم ہیں اور ہم لوگوں کو چاہئے کہ ہم ان علاقوں پر اسلام دشمن جماعتوں کا منحوس سایہ نہ پڑنے دیں۔ مثلاً مصر میں دس سرگرم اسلامی جماعتیں موجود ہیں لیکن انمیں سے صرف ایک ہی جماعت ایسی ہے جو ایرانی انقلاب اور امام خمینی کے سلسلے میں خوش عقیدہ ہے اور باقی تمام دوسری تنظیمیں مختلف افکار و عقائد کی حامل ہیں۔

ہمارے انقلاب کی ایک اہم پریشانی یہ ہے کہ مذہب تشیع کی شناخت واشاعت کے سلسلے میں اسلامی انقلاب کے ترجمانوں کا طریقہ بالکل مختلف ہے۔ ان لوگوں میں سے اکثر افراد کا یہ عقیدہ ہے کہ امام خمینی کے اقوال وارشادات کے برعکس یہ انقلاب اسلامی نہیں ہے بلکہ شیعی ہے۔ ایسے افراد کی تعداد زیادہ ہے، جو حقائق کو اپنے نظریہ کے مطابق توڑ مروڑ کر پیش کر رہے ہیں جس کی وجہ سے نامناسب رد عمل پر مشتمل حوادث رونما ہونے لگتے ہیں۔ بہر حال اس داستان کی شرح بہت تفصیلی ہے جس کو ایک سوال کے جواب میں محدود نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ اس موضوع پر ایک مفصل کتاب لکھنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ میں کیا عرض کرنا چاہتا ہوں اور یہ کہ امام خمینی کے ابتدائی اقوال وارشادات اور ان کے بعد بعض افراد کی راہ وروش کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے وہ معمولی نہیں ہے۔

سوال: تقریب مذاہب اسلامی عالمی تنظیم نے اسلامی انقلاب امام خمینی اور مقام معظم رہبری آیت اللہ سید علی خامنہ ای کے افکار و عقائد کی پیروی کرتے ہوئے کون سے عملی قدم اٹھائے ہیں۔

جواب:اس عالمی تنظیم کی عمدہ ترین سرگرمی درحقیقت اسلامی مذاہب کے مفکرین اور دانشوروں کو اپنے اعمال واقدام کے ذریعہ متاثر کرتا رہا ہے جس کو درج ذیل انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

۱۔دار التقریب مصر میں ۱۵ جلدی مجموعہ "رسالۃ الاسلام" کی دوبارہ اشاعت

۲۔ فصل نامہ رسالۃ التقریب کی اشاعت۔

۳۔ معاشروں کے درمیان وحدت واتحاد پیدا کرنے والے مقالات اور کتب کی عربی وفارسی زبان میں اشاعت۔

۴۔وحدت اسلامی عالمی کانفرنس کی تشکیل۔یہ کانفرنس ہر سال ہفتہ وحدت یعنی حضرت ختمی مرتبت محمد بن عبد اللہؐ اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ولادت باسعادت کے موقع پر تہران میں منعقد کی جاتی ہے جس میں دنیائے اسلام کے سیکڑوں نامور علماء ودانشور حضرات شرکت کرتے ہیں اور اپنے مقالات میں ایسے سیکڑوں موضوعات کا علمی تجزیہ پیش کرتے ہیں جن کے ذریعہ مسلمانوں کے مختلف مذاہب کے درمیان قربت ونزدیکی اور وحدت واتحاد قائم ہوسکے۔اس سلسلے کی ۱۹ویں عالمی کانفرنس "سازمان فرہنگ وارتباطات اسلامی کی طرف سے منعقد ہوئی تھی جس کا موضوع تھا۔ "پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ اطہارؑ کی سیرت کی روشنی میں وحدت اسلامی" اس کے علاوہ ۲۰ویں عالمی کانفرنس کا موضوع "اسلامی مذاہب میں حکومت کا تصور ہے"۔

۵۔صوبائی سطح پر بالخصوص برادران اہلسنت کی اکثریت والے وعلاقوں میں سیمیناروں کا اہتمام۔ان سیمیناروں میں یہ تنظیم بھرپور انداز میں شرکت کرتی ہے جس کے نتیجے میں برادران اہلسنت اور اہل تشیع کے درمیان اخوت وبرادری کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔

۶۔مکہ معظمہ میں حج اور وحدت اسلامی" سیمینار کی تشکیل:۔یہ سیمینار حج کے زمانے میں منعقد ہوتا ہے جس میں ساری دنیا کے مسلمان علماء ودانشور شریک ہوتے ہیں اور ہر سال اس سیمینار میں عالم اسلام کے ایک مسئلہ پر گفتگو کی جاتی ہے۔

۷۔بیرون ملک علاقائی اور صوبائی سطح پر وحدت اسلامی کے موضوع پر مختلف اجتماعات کی تشکیل جس میں اسی علاقے کے لوگوں کو مذاکرہ میں شریک کیا جاتا ہے جس علاقے میں اجتماع منعقد ہوتا ہے۔اس

طرح کے اجتماعات در حقیقت اسلامی بھائی چارہ کی تبلیغ واشاعت میں بہت معاون اور کار آمد ثابت ہوئے ہیں۔

۸۔ تنظیم کے علماءودانشوروں کو دیگر اسلامی ملکوں میں بھیجنااور اسلامی ممالک کے نامور افراد کوایران مدعو کرنا۔اس قسم کی باہمی ملاقات وگفتگو کے اہتمام کی برکت سے سنی اور شیعہ علماء کو یہ موقع فراہم ہوتاہے کہ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان سکیں اور دونوں مل کر وحدت اسلامی اور پرچم اسلام کی سربلندی کے لئے لازمی کوشش انجام دے سکیں۔

۹۔ مختلف اسلامی مذاہب اور فرقوں کے سلسلے میں مطالعاتی اور تحقیقاتی مراکز کی تشکیل،اسلامی فرقوں کے عقائد و نظریات کی مکمل شناخت۔اس کے علاوہ مختلف اسلامی مذاہب سے مربوط علم فقہ۔اصول اور کلام کا مکمل تجزیہ یہ اس عالمی تنظیم کی نہایت مفید علمی سرگرمی کی دین ہے۔اس قسم کے چھوٹے بڑے علمی اجتماعات کو منعقد کرنے والا مرکزی دفتر قم میں واقع ہے اور یہاں باصلاحیت افراد اسلامی مذاہب کا بھرپور مطالعہ کرنے میں سرگرم رہاکرتے ہیں

ان تمام سرگرمیوں کے نتیجے میں اب تک عربی اور فارسی زبان میں وحدت اسلامی کے موضوع پر سیکڑوں مقالات اور کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جو مختلف اسلامی مذاہب کی مشترکہ میراث ہیں جس کے مطالعے سے اس بات کی قوی امید ہے کہ علماء و محققین کے ذہن میں غیر معمولی فکری انقلاب پیدا ہو جائے۔

۱۰۔اسلامی مذاہب کی یونیورسٹی کاقیام۔مختلف اسلامی مذاہب کے علوم و معارف پر مشتمل اس دانشگاہ کا قیام اس عالمی ادارہ کی بہت بڑی خدمت ہے۔اس یونیورسٹی کا بنیادی مقصد مختلف اسلامی مذاہب کے مطابق علم فقہ ،علم اصول اور علم کلام کی تعلیم و تحقیق کی سہولتیں فراہم کرنا ہے جس میں داخلی اور خارجی طالب علم و محققین اپنے مطالعاتی و تحقیقاتی پروگراموں میں لگے رہیں۔اور اپنے مذہب کی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ دیگر اسلامی مذاہب کے بارے میں مفید اطلاعات حاصل کر سکیں اور اس عالمانہ روش کے ذریعہ مذاہب کے درمیان اتحاد کی عملی راہ ہموار ہو سکے۔

☆☆☆☆☆☆